

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

انہ سے سطور کو لکھتے وقت پندرہویں صدی ہجری کے پہلے ماہ ربيع الاول کی دوسری دہائی ختم ہونے والی ہے۔ اور یہ شمارہ جب فارغین کو ملے گا تو اس وقت ربيع الاول انتہام کو پہنچ رہا ہوگا۔ اس موقع پر ایک لمحہ فکر یہ!

اسلاہر آباد اور راولپنڈی میں میں نے دیکھا کہ ۱۲ ربيع الاول کو عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی۔ کوئی حساب نہ تھا جھنڈیوں کا جو سر کو چرو بازار میں لہرا رہی تھی، رنگ بزرگی روشنیوں کے ہر طرف ریلے تھے اور سچوم مردوزن کے میلے۔ سیرت کی سرکاری کانفرنس کے علاوہ ہر مسجد اور محل میں جلسہ سیرت تھا۔ اور ہر محلے اور ادارے کے زیر اہتمام میلاد کی مجالس ہو رہی تھیں۔ بے شمار گرتیوں سے مہک دار دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ مٹھائیوں کی دکانوں پر کھوٹے اور شکر اور میدے اور گھی سے بنی ہوئی چوکور اور گول اور رنگ بزرگی مٹھائیوں کے پہاڑ کھڑے تھے۔ جلوں رواں تھا، بلکہ کئی کئی جلوں ادھر سے ادھر متحرک تھے جن کی دج سے ٹریفک بند تھا۔ طرح طرح کے ملکی اور غیر ملکی لباس پہنے محمّد رسول اللہ کے آئینوں کی ٹولیاں درود و سلام پڑھتی اور قرالی کے طرز پر نعتیں گاتی گامزن تھیں۔

یہی سماں ہر شہر میں ہوگا، اور اس سے کم تر سہی، مگر دیہات میں بھی کہا گہی ہوگی سوال یہ ہے کہ کیا یہ تہوار سی جشن ہمارے کرداروں میں عیدیلیاں لانے کے لحاظ سے بھی کچھ افادیت رکھتے ہیں۔ خدا و رسول کے مقرر کردہ دو مبارک دن — یوم عید الفطر اور یوم عید الاضحیٰ ہوں یا

خود ہماری ایجاد کردہ تقاریبِ محرم و میلاد، ان کی رونق برسوں سے قائم ہے بلکہ مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ان چاروں مواقع پر ہر سال تلوٹلو آدمیوں کے اخلاق اور معاملات میں تغیر آتا تو ہم ۳ برس کے عرصے میں ہمارے یہاں تیرہ ہزار چھ سو کی تعداد میں صادق و امین افراد پیدا ہو سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ سوچئے کہ کتنے رشوت لینے والے ہیں جو یومِ میلاد کے موقع پر حضورؐ کی یاد تازہ کر کے یا حضورؐ کی دعوت و سیرت اور اعجازات و کمالات کو سن کر رشوت لینا ترک کر دیں؟ کتنے لوگ بے جا فقع اندوزی سے تائب ہوتے ہوں گے؟ کتنے اپنی لنگاہوں کے راہواروں کو حرام کی چراگاہ میں داخل ہونے سے باز رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوں گے؟ کتنے حکام و عمال کبر و ظلم کا طریقہ چھوڑ کر عوام سے محبت و خدمت کا طرزِ عمل شروع کر دیتے ہوں گے؟ کتنے لکھنے والے نطق و بیان کی قوت کو اسلامی اقدار کے خلاف، بیگانہ و مخالفا نظریات کی سر بلندی سے روک لیتے ہوں گے؟ کتنے قوی لوگ ضعیفوں کو تنگ کرنے سے باز آجاتے ہوں گے؟ کتنے شرابی اور جواہی شراب اور جودے سے تائب ہوتے ہوں گے؟ کتنے بے نمازی ایسے مبارک موقعوں کے زیر اثر مسجدوں کی صفوں میں اکھڑے ہوتے ہوں گے؟ کتنے اہل مال اسراف و تبذیر سے پرہیز کا فیصلہ کرتے ہوں گے؟ کتنی بے پردہ خواتین ایک انقلابی جذبے سے برقعہ یا چادر اڑھ لیتی ہوں گی اور مخلوط مجالس میں شرکت کو ترک کر دیتی ہوں گی؟ کتنے واعظ لوگوں کو بیوقوف بنانے اور بے سند کہانیاں سنانے اور فرقہ وارانہ نزاعات بھڑکانے سے باز آجاتے ہوں گے؟

میں نے اپنی عمر معاشرے میں چل چھپر کر گزاری ہے، اور امیروں اور غریبوں، عالموں اور جاہلوں اور حاکموں اور محکوموں کے حالات کو اچھی طرح دیکھا سمجھا ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ بالعموم مختلف دینی تقاریب سے باہر بار گذرنے کے باوجود جو جہاں ہوتا ہے، وہیں رہتا ہے، جس کی جو عادات اور مشاغل ہیں، ان میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔ بلکہ جو جتنا گیا گذرا ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ دینی تہواروں میں بڑھ کر قدم مارتا ہے۔ بیواؤں کس جوش سے محرم اور میلاد مناتی ہیں، تارکِ صوم حضرات کس مٹھاٹھ سے عید کا جشن مناتے ہیں۔ حرام کما بیاں کرنے والے کتنا کتنا خرچ کر کے قربانیاں دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے سنگم حج کر کے پچھلے گناہ بخشوانتے اور اپنے زعم سے نیا لائسنس حاصل کرتے ہیں۔

ان گنتی کی مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر یہی جو بہر حال کسی بھی تحریک سے نیکی کی جانب جھک جاتی ہیں،

مگر جن کی سلیم الفطرتی عام بگاڑ کے سیلاب کا رخ موڑنے پر قادر نہیں ہوتی۔ بقیہ اکثریت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عین ان مبارک دلوں میں بھی ظلم و گناہ کی درانتی سے حرام کی کھیتوں سے فصلیں کاٹتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے ؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ایمان خوابیدہ ہیں، آدھگتے رہتے ہیں، اور کوئی ان کو جگاتا نہیں۔ ایمان ہمیشہ اعلیٰ درجے کے شعور کے ساتھ ابھرتا ہے، مگر یہاں شعور کی تربیت کا کوئی سرور سامان نہیں ہوتا۔ سارا زور جذباتیت پر ہوتا ہے اور دین حق اور اس کے پہنچانے والے عظیم انسان و پیغمبر سے ہمارا معاملہ و مافیٰ طرز کار ہوتا ہے۔

جن طبقوں کا فرض تھا کہ وہ ایمانوں کو جگاتے، شعور کو ابھارتے اور لوگوں کے دل و دماغ کو ایک انقلابی داعیے سے مالا مال کرتے، ان میں سے کچھ تو اپنے علم کی بہار دکھانے کے درپے رہتے ہیں، کچھ جذباتی لہروں پیدا کرنے کے ماسوا کچھ نہیں کر سکتے، کچھ لوگوں کو حضور کی شخصیت و سیرت کو ایسی فوق الانسانی عجوبوں کا مجموعہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ عوام میں جذبہ طاعت و اتباع پیدا ہو ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ اپنی انسانیت کو اپنے ارتعاع میں ناقابل عبور کا درٹ سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو حضور کی ذات اور کارنامے کو اپنی مخصوص فرقہ وارانہ رنگین اور محدود عینک سے دیکھنے اور دکھاتے ہیں اور ان کو سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ سامع یا قاری ان کے فرقے سے چپکا رہے۔ پھر حضور کی شان کو بلند سے بلند تر کر کے دکھانے والے حضرات لوگوں پر پراثر ڈالتے ہیں کہ حضور سے نسبت رکھنا اور حضور پر درود بھیجنا حضور کی شفاعت کے لیے کافی و کافی ہے، چاہے معاش و معاشرت کے اعمال و احوال کچھ ہی ہوں۔

اور پھر جدید تعلیم یافتہ حضرات کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو رسول برحق کی شان میں فلسفیانہ مقالات لکھ کر ان کو بھاری بھر کم دانشورانہ اصطلاحات سے آراستہ کر کے تعلیم یافتہ لوگوں سے داویت اور سادہ لوگوں کو مرعوبیت میں ڈال کر چھوڑ دیتا ہے۔

بحیثیت مجموعی ہماری تقاریب و تقاریر اور کانفرنسوں اور جلسوں پر نمائش کا اتنا تیز رنگ چڑھ گیا ہے کہ اخلاص کی روح کا پتہ نشان لگانا مشکل ہو گیا ہے اور ذہنوں میں انقلاب یا کرداروں میں تغیر

پُر ذور رُوحِ اخلاص سے کام لیے بغیر نہیں لایا جاسکتا۔

رسولِ خاتم النبیین ایمان اور خلق کے جس رتبہ بلند پر فائز ہیں اور جو مقامِ قرب و مقبولیت بارگاہِ الہی میں آپ کو حاصل ہے، وہ اجمالاً ہر اس شخص پر واضح ہے جو حضور پر ایمان رکھتا ہے۔ پس ہر سال، ہر جلسہ سیرت میں اور ہر مسجد کے منبر سے اس انسانِ اعظم کی رفعتوں کو بیان کرتے رہنا کافی نہیں، اُمت کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس ہستی مبارک کے ساتھ آپ لوگوں کا تعلق کیا ہونا چاہیے اور حضور کے کون سے حقوق آپ پر واجب آتے ہیں جن کے ادا کرنے سے ایمانی و اخلاقی اور انفرادی و اجتماعی زندگی سنورتی ہے۔ ضرورت اس ہستی بلند کی رفعتوں کی جانب بڑھنے کی ہے تاکہ ہم نفس پرستی اور دنیا پرستی کے چکر سے نکل سکیں۔

یہاں جناب رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حقوق عرض کیے جاتے ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر دین کی فلاح و سعادت کا حصول ممکن نہیں۔

رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم حضور پر ایمان لائیں۔ اس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں، قرآن اس مطالبے سے بھرپور ہے، اذ انوں میں رسالت کی شہادت دی جاتی ہے، اسلام لانے کے لیے شرط لازم خدا کی توحید کے ساتھ حضور کی نبوت پر ایمان لانا ہے۔ انہی دو باتوں پر کلمہِ رھیبہ مشتمل ہے۔

مگر ایمان کی حقیقت و ماہیت سے عام طور پر ناواقفیت پائی جاتی ہے۔ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام نہیں، قلبی تصدیق بھی چاہیے۔ ایمان شعور کا بھی درجہ کمال ہے اور جذبات کی حرکت بھی رکھتا ہے۔

انسان کی پوری ہستی اور اس کی جملہ ذہنی و قلبی اور عقلی و جذباتی کیفیات جب کسی حقیقت کی جانب بھر پور طریق سے متوجہ ہو جاتی ہیں تو پھر وہ حقیقی اور مکمل ایمان سے مالا مال ہوتا ہے۔ خود ابیدہ ایمان، غیر شعوری ایمان، غیر جذباتی ایمان، گنگن ایمان، تشکیک آلودہ ایمان یہاں مطلوب نہیں ہے، ایسا ایمان مطلوب ہے جو زندگی پر چھا جائے اور تمام معاملات و مسائل کی باگ ڈور سنبھال لے۔

ماننے کی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ حضورؐ نبی و رسولؐ تھے یا اولاد ہیں، بلکہ اس کا لازمی پہلو یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے کے لیے ہادی، مرشد اور قائد و رہبر ہیں۔ حضورؐ پر ایمان لانے والے کے لیے جائز نہیں رہتا کہ وہ کسی اور کو زندگی کا ہادی و مرشد یا فکری و عملی قائد و رہبر بنا تسلیم کرے۔

ایمان بالرسالت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہؐ کو آخری نبی تسلیم کیا جائے جن کے آنے سے دین مکمل ہوا، الہی نظام ہدایت قیامت تک کے لیے ساری انسانیت پر واجب القبول ہوا اور آخری شریعت ایک ایسا وسیع و جامع پیرایہ اختیار کر گئی کہ وہ ہر قسم کے معاشروں میں نافذ ہو کر ان کو پیش آنے والے نوبتوں مسائل کو حل کر سکتی ہے۔

اس لیے ایمان کا ایک لازمی تقاضا رسول اللہؐ سے محبت رکھنا ہے۔ آدمی جس کسی پر حقیقت میں ایمان لاتا ہے اس سے محبت کرتا ہے۔ اس سے بے رُخی اور بے توجہی نہیں برتا۔ حضورؐ کے اپنے ارشاد کے مطابق آپ سے ایسی محبت رکھنا ہم پر واجب ہے جو بہادر ماں باپ، اہل و عیال اور مال و منال ہر چیز کی محبت کے مقابلے میں زیادہ زور دار ہو۔ تمام محبتوں پر غالب آجائے۔

منشایہ ہے کہ جب کسی معاملے میں حضورؐ کے احکام اور اپنے اقرباء و اعزہ کی خواہشات یا مالی مفاد میں تضاد ہو جائے تو حضورؐ کی محبت کی خاطر مقابل کے تمام رجحانات کو قربان کر دینا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔

محبت کی ایک ابتدائی شکل ادب ہے۔ حضورؐ کے ادب کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آپ کا نام احتراماً القاب و آداب کے ساتھ لیا جائے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے خدا و آداب سے آگے نہ بڑھا جائے۔ (لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ) اونچی آواز میں حضورؐ کے سامنے بات نہ کی جائے (لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی)۔ ان احکام کا تقاضا آج یہ ہے کہ ہم سب کا مرتبہ خدا کے حضور بندگی کا اور رسول اللہؐ کے سامنے اطاعت گزار امتی کا سا ہونا چاہیے۔ جو کچھ ارشادات ادھر سے ہوں ان کے متعلق بڑھ بڑھ کر باقی نہ بنائی جائیں اور بڑے بول نہ بولے جائیں۔

آج حال یہ ہے کہ بعض بد بخت حضورؐ کا یا حضورؐ کی شریعت کا مذاق تک اڑاتے ہیں، بعض حضورؐ کی ثابت شدہ احادیث کو بے وقعت گردانتے ہیں، بعض بڑی بے باکی سے قرآن و حدیث میں تحریفیں

کہتے ہیں، بعض حضور کو بطور اسوہ و نمونہ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ خدا کی مرضیات و احکام کے بھی خلاف ہے، اور حضور کے سامنے شدید گستاخی بھی۔ حضور کے سامنے گستاخی کی سزا بربادی اعمال بتائی گئی ہے، یعنی کیا کرایا سب غارت۔

رسولِ برحق کا تیسرا حق جو ایمان اور محبت کا لازمہ ہے، یہ ہے کہ حضور کی اطاعت کی جائے۔ قرآن میں اطاعتِ رسول کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ خدا کی اطاعت کی صورت بھی یہی ہے کہ حضور کی اطاعت کی جائے، کیونکہ آپ کو تمام انبیاء کی طرح امت کے لیے مطاع و واجب الطاعت اٹھہرایا گیا ہے۔ اطاعت ایک تو اس حیثیت سے کہ رسول خدا ہمارے لیے معلم و مرگزی ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کے سانچے میں ڈھلنا ہم پر واجب ہے۔

دوسری حیثیت حضور کے شارح ہونے کی ہے۔ ہر وہ چیز جسے شریعت کے طور پر آپ نے تلقین فرمایا وہ ہمارے لیے اسی طرح واجب الطاعت ہے جیسے قرآن مجید میں بیان شدہ خدا کے اوامر و نواہی۔

تیسری حیثیت حکم ہونے کی ہے۔ یعنی زندگی کا جو بھی جھگڑا اور اختلاف سامنے آئے اس کا فیصلہ حضور کی تعلیم سے طلب کیا جائے گا۔ بات چاہے نظریاتی بحث و جدال کی ہو، گھریلو اور کاروباری نزاعات ہوں، عدالتی مقدمات ہوں یا اسمبلیوں کی بحثیں، ان سب میں اگر حضور کو حکم تسلیم نہ کیا جائے، آپ کے اوامر و نواہی کو خوشی خوشی تسلیم نہ کیا جائے۔ اور ادھر سے جو رہنمائی دی گئی ہو اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیا جائے تو سرے سے ایمان ہی کی غیر نہیں۔ (لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجی بینہم)۔

چوتھی حیثیت شارحِ وحی اور مبینِ قرآن ہونے کی ہے۔ یعنی قرآن نے اعلیٰ درجے کے حکیمانہ انداز سے جن حقائق یا احکام کو بیان کیا ہے ان کی تفصیل نہ صرف زبان سے بتانا بلکہ عمل کر کے دکھانا کہ قرآن کا منشا اس طرح ہے، یہ حضور پاک کا مقرر شدہ منصب ہے۔ حضور پر ایمان لانے والے ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اس منصب کو تسلیم کرے اور دین و شریعت کی حقیقت کو اس طرح قبول کرے جیسے حضور نے اسے پیش کیا، اور اوامر و نواہی پر اس طرح عمل کرے جس طریق سے حضور

نے عمل کیا۔

پانچویں حیثیت اسوہ و نمونہ ہونے کی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے لیے اپنے رسول کو اسوہ نمونہ قرار دیا۔ جو اسوہ و نمونہ وہاں سے اس کی پیروی کرنا لازمہ ایمان ہے۔

چھٹی حیثیت قائد و رہنما کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے مستقیماً قائد و رہنما ہیں۔ دین کا کام جس طرح آپ نے کیا، اس کے مختلف مراحل سے جس طرح گزرے، زندگی کے مختلف معاملات میں جو رہنمائی آپ نے دی، زندگی کا جو نظام اور اس کے مختلف شعبوں کا جو ڈھانچہ آپ نے قائم کیا اور خدا پرستانہ بنیادوں پر جس نقشے پر ایک جامع تہذیب و تمدن کو استوار کیا۔ یہ سارا کچھ ہمیں اس ایمانی جذبے سے جموں کاتوں قبول کرنا ہے کہ اس کی تلقین ہمارے قائد و رہنما نے کی ہے۔ نبی اکرم کو قائد و رہنما ماننے کے بعد، عملاً زندگی کی رہنمائی کی بھیک کسی اور دروازے سے مانگنا یا فکری و عملی دائرے میں باطل کے کسی علمبردار کو قائد و رہنما ماننا یا مسلمانوں میں سے کسی کو یہ درجہ دینا کہ وہ حضور کی تعلیمات میں رد و بدل کر سکتا ہے یا وہ بھی ویسی ہی قیادت و رہنمائی کا مقام رکھتا ہے، یہ ساری باتیں ایمان بالرسالت کے خلاف ہیں۔ حضور پر ایمان لانے والے بزرگانِ دین، علماء و مفکرین اور فقہاء و صلحاء کا صرف یہ مقام تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے ذریعہ نبی حضور کی قیادت و رہنمائی سے استفادہ کرنے کا نیز حضور کی بارگاہِ علم و حکمت تک پہنچانے کا۔

ان ساری حیثیتوں سے رسول اللہ کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ جو کوئی دالستہ آپ کی اطاعت کو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ محبت کے دعوے اگر کرتا ہے تو کھوکھلے دعوے ہیں۔ اس محبت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص صبح سے شام تک کسی آقا کے سامنے اس کی مدح و ستائش کرتا رہے اور ”میں قربان، میں قربان“ کی رٹ لگاتے رکھے، لیکن آقا کی طرف سے اگر کہا جائے کہ ذرا پانی کا ایک گلاس لا دو، تو وہ سنی آن سنی کر دے اور ٹس سے مس نہ ہو۔

ایک شخص اپنے اعتقاد کو وہ شکل نہیں دیتا، جیسی حضور نے مقرر کی، وہ قرآن اور حضور کی تعلیمات سے آگاہی حاصل نہیں کرتا، وہ عبادات کی پابندی نہیں کرتا، وہ حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہے، وہ ادنیٰ ادنیٰ مفاد و نیوی کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ وہ مخالف اسلام نظریات کا (باقی صفحہ ۲۳۹)